دائم محمد انصاری (کلکتہ)

'ایک خنجر پانی میں': ایک تجزیہ

موت انسانی زندگی کی شاید وہ اکلوتی سچائی ہے جسکا عرفان انسان کو پیدائش کے فوراً بعد ہی ہو جاتا ہے۔ ہماری اس 'خوبصورت دنیا' میں خدا کا تصور ہمیشہ سے نشانہ ہدف رہا اور خدا کے وجود سے منکر لوگوں کی کثیر تعداد کھلے آسمان کے نیچے سانس لیتی نظر آتی ہے لیکن موت انسان کی وہ محبوبہ ہے جس کے مکروہ حسن کا نظارہ نہیں کیا جاتا، وصل کی خواہش نہیں کی جاتی۔ دکھ کی مابعد الطبیعات کو اپنی تحریروں کا لقب دینے والے خالد جاوید کا تازہ ناول 'ایک خنجر پانی میں' بقول مصنف ''یقیناً موت کی تیسری کتاب'' ہے۔ ہوسکتا ہے اس کے بعد ہمارے سامنے موت کی چوتھی اور پانچویں کتاب بھی آسکتی ہے (جیسے اردو کی پہلی، دوسری اور تیسری کتاب ہم نے عہد طفلی میں پڑھی تھیں)۔ بحیثیت کردار 'موت' کو انسانی دکھوں کے تناظر میں یوں پیش کرنا کہ موت کی حقیقت اپنی پوری معنویت مع (ناول نگار کے اپنے) فلسفہ حیات کے ہمارے سامنے روشن ہو جائے، خالد جاوید کے تازہ ناول 'ایک خنجر پانی میں' کا خاص مقصد ہے۔ اور سچ پوچھئے تو خالد جاوید اس بات کے لئے مبارک باد کے مستحق ہیں کہ ہمارے نثری ادب میں جہاں ادیب برسوں کی ریاضت و مجاہدہ کے بعد شاید ہی کوئی ایسا کردار تخلیق کر پاتے ہیں جو ہمارے تذکروں میں زندہ رہنے کے قابل ہوتا ہے، وہیں خالد جاوید نے موت کو بحیثیت کردار منتخب کر، اس کے سیاہ جسم پہ انسانی مصائب و آلام کا سیاہ ترین لبادہ اوڑھا کر کسی ملکہ کی طرح ہمارے روبرو یوں پیش کر دیا کہ اب ہماری زبان گنگ ہے کہ اس کردار کی موت کیونکر ممکن ہے۔ لیکن اب جب کہ 'موت' اردو ادب کے خانوادے کا ایک فرد بن گئی ہے، ضروری ہے کہ 'ایک خنجر پانی میں' موت بحیثیت کردار اور الگ الگ واقعات کے ذریعہ قاری پر موت کا خاکستری نقش ثبت کرنے کی کوشش میں کردار نگاری اور ناول کے پلاٹ کی حرمت پہ جس طرح حرف آیا ہے اس کی مناسبت سے چند بے لاگ گفتگو کی جائے۔

خالد جاوید صاحب اپنی تحریروں میں بڑے طمطراق سے موت کی آمد اور اسکا پس منظر (جو ہمیشہ انسانی دکھوں کا عکاس ہوتا ہے) بیان کرتے ہیں گرچہ وہ اس بات کا پورا التزام رکھتے ہیں کہ کہانی میں موت کی صورتحال کیسی بھی کیوں نہ ہو، اس کا ذمہ دار یا تو وہ کردار خود ہوگا یا اس کے گرد و پیش یا اس

کے اپنے خانگی مسائل اس کا جواز بنیں گے، یا پھر مشکلات اور پریشانیوں میں گھرے ہوئے انسان کی اپنی نفسیات اس کا سبب فراہم کرے۔ اس چکر میں اور کچھ ہو نہ ہو، اتنا ضرور ہوتا ہے کہ کئی ایک مقامات پر موت کا وارد ہونا غیر ضروری اور غیر فطری معلوم ہوتا ہے جس سے قبل از موت کا پس منظر، اس کا بیانیہ، اس میں شامل کردار اور متعلقہ واقعہ کا ذکر بے معنی سا نظر آتا ہے۔ ناول ''ایک خنجر پانی میں'' تین مقامات پر تین الگ الگ کرداروں کی موت ہوتی ہے (اگر ہم وبا سے ہسپتال میں مرنے والے لوگوں کو نہ شامل کریں تو)، لیکن یہ واقعات جس تناظر میں پیش آتے ہیں انکا ذکر میرے مفروضے کو شاید بہتر طریقے سے ثابت کر دے۔ پہلا نمونہ دیکھئے جو ذرا طویل اور اکتا دینے والا تو ہے مگر کیا کیا جائے:

(الف) ''وہ پاگل کی طرح بڑبڑاتا ہوا دوبارہ غسل خانے میں جا رہا ہے۔ شاید تولیہ باندھنے۔ عورت اس سے بھی زیادہ پاگل ہوتی ہوئی اس کے پیچھے پیچھے غسل خانے میں گھس آتی ہے، کسی بلا یا وبا کی طرح۔ کیا کرے گا۔ مار ڈالے گا۔ کیا پوچھے گا بھڑوے کی اولاد۔ وہ بے لباس، گیلا اور بدبودار اس کے سامنے کھڑا غیظ و غضب سے کانپ رہا ہے۔ اس کا ہاتھ اوپر اٹھتا ہے۔ وہ عورت کو پوری طاقت کے ساتھ پیچھے کی طرف دھکا دیتا ہے۔ وہ تھوڑا سا پیچھے کی طرف جھکتی ہے اور پھر سنبھل کر جواباً اس کی گردن پکڑ کر دیوار کی طرف دھکیلتی ہے۔ گیزر کے بالکل نیچے۔ اچانک بجلی آجاتی ہے۔ گیزر کی لال بتی روشن ہوتی ہے۔ اپنے آپ کو گرنے سے بچانے کے لئے وہ کسی چیز کا سہارا لینا چاہتا ہے۔ وہ دیوار پر لگے بجلی کے ساکٹ کو تھام لیتا ہے۔ ایک دھماکہ۔ روشنی کا ایک جھماکہ۔ شارٹ سرکٹ۔ ایک زوردار جھٹکا کھاتے ہوئے اس کا مادر زاد برہنہ جسم کسی وزنی پتھر کی مانند لڑھکتا ہوا بالٹی سے ٹکراتا ہے۔ بالٹی الٹ گئی، گندے بدبو دار پانی سے اس کے جسم کا نچلا حصہ تر ہو گیا ہے۔ اس کے دانت پہلے کٹکٹاتے ہیں۔ پھر بھنچ جاتے ہیں۔ منہ ٹیڑھا ہو کر نیلا پڑنے لگا ہے۔ نیلاہٹ آہستہ آہستہ سارے جسم میں رینگ رہی ہے۔ کچھ لمحوں تک کے لئے اسکا نیلا جسم کسی عامیانہ قسم کے آلہ موسیقی کی طرح جھنجھناتا ہے۔ پھر بے جان ہو جاتا ہے۔ غسل خانے میں اب ایک اور بو بھی آکر شامل ہو جاتی ہے، یہ موت کی بو ہے۔ چند گھنٹوں بعد یا زیادہ سے زیادہ ایک دن کے بعد اس کے کمرے میں الماری کے نیچے رکھے ہوئے اس کے جوتوں کے تلووں میں چپکی ہوئی موت واپس قبرستان کی طرف رینگ جائے گی۔ موت کا یہ محبوب مشغلہ ہے، گھر سے قبرستان۔ قبرستان سے گھر۔'' (ص۔ ۴۸،۴۷)

اب یہاں میری سمجھ میں کئی باتیں نہیں آرہی ہیں۔

بڑبڑاہٹ دھیمے لہجے کی خود کلامی ہے جو دوسروں کے کانوں کے لئے نہیں ہوتی اور کسی شخص کا بڑبڑانا ایک عام سی بات ہے۔ اس میں 'پاگل کی طرح بڑبڑانا' اپنے آپ میں کیا مفہوم رکھتا ہے؟ کیا پاگل شخص کے

بڑبڑانے کا انداز عام لوگوں سے مختلف ہوتا ہے؟
دوسرا، عورت کو پوری طاقت سے پیچھے کی طرف دھکا' دینے کے باوجود عورت تھوڑا سا ہی پیچھے کو جھکتی ہے۔ پھر وہ سنبھلتی ہے۔ اس کے بعد اپنے شوہر کی گردن پکڑتی ہے اور وہ اپنے شوہر (بھڑوے کی اولاد) کو دیوار کی طرف اس طرح دھکیلتی ہے کہ 'گیزر کے بالکل نیچے' دیوار سے اس کا جسم ٹکراتا ہے اور ٹھیک اسی وقت بجلی واپس آجاتی ہے، گیزر کی لال بتی روشن بھی ہوتی ہے اور وہ مرد جسے عورت نے دھکیلا ہی دیوار کی طرف تھا اور جس کو سنبھلنے کے لئے دیوار کا سہارا ہی کافی تھا، وہ شامت کا مارا نل کی ٹونٹی یا دیوار کی پشت نہ تھام کر سیدھے بجلی کا ساکٹ ہی تھامتا ہے اور فی الفور مر جاتا ہے۔ دانت کا کٹکٹانا، بھنچ جانا، جسم کا نیلا پڑنا اذیت ناک موت کا تاثر قائم کرنے کے لئے بیان کیا گیا ہے۔ لیکن مجھے ذرا افسوس اس بات پر ہے کہ 'موت کی بو'، 'قبرستان کی طرف واپس رینگنا' جیسے لفظیات کا استعمال اور غسل خانہ میں اپنی بیوی سے دوران تکرار ننگے مرد کی بجلی کے جھٹکے سے اتفاقیہ موت کے باوجود میرے ذہن پر نہ ہی موت کا کوئی ہیبت ناک تاثر ابھرتا ہے اور نہ ہی اپنے دل میں اس شخص کے لئے ہمدردی محسوس کر پاتا ہوں جسکا جلا ہوا سیاہی مائل جسم غسل خانہ میں ننگا پڑا ہوا تھا۔ اب یہاں یہ توجیہ دی جاسکتی ہے کہ خالد جاوید اس پورے واقعہ کے ذریعہ اپنے قاری پر موت کی ہیبت کا تاثر ابھارنے کے ساتھ ساتھ زن وشوہر کے مابین ازدواجی زندگی کی ناکامی اور ان دونوں کی ذہنیت کا ایک نقش نیز رشتوں کے زوال کی ایک سفاکانہ تصویر بھی پیش کرنا چاہتے تھے جہاں عورت ومرد کے باہمی رشتے میں عزت نفس کا تصور ہی سرے سے ختم ہوگیا ہے۔ ممکن ہے وہ اس ایک واقعہ کے ذریعہ کئی ساری باتیں بین السطور کہنا چاہتے تھے لیکن میں نے عجلت سے کام لیتے ہوئے بس اپنے مطلب کی بات اچک لی اور بقیہ نظر انداز کردیا۔ کاش ایسا ہی ہوتا۔

اب مضحکہ خیز اور جلد باز موت کا ایک دوسرا نمونہ دیکھئے:

(ب) ''عورت اندھے مرد کے بہت قریب کھڑی ہوئی غصے سے کانپ رہی ہے اور اس کے منہ سے تھوک کے جھاگ اڑ رہے ہیں۔ آنکھیں سرخ ہیں اور اپنے حلقوں سے باہر ابل آئی ہیں۔ اس کے جبڑے پھیل گئے ہیں۔ وہ پاگل کتیا نظر آرہی ہے۔ دفعتاً اندھا اپنی ٹوٹی اور پلاسٹر چڑھی ہوئی ٹانگ سے اس کے پیٹ پر ایک زبردست لات مارتا ہے۔ عورت تھوڑا سا پیچھے کی طرف پھسلتی ہے پھر سنبھل کر سیدھے کھڑے ہوکر اندھے کے منہ پر نفرت سے تھوک دیتی ہے۔ تھو۔ تھو۔ تھو۔ تھو۔ اندھا دوبارہ اس کے پیٹ پر لات مارتا ہے۔ عورت میز پر رکھے ہوئے پانی کے جگ کو اس کے سر پر دے مارتی ہے۔ کچے شیشے کا بنا ہوا جگ اندھے کی کھوپڑی سے ٹکرا کر چور ہوجاتا ہے اور پانی سے اس کا سر اور اس کے کندھے

بھیگ جاتے ہیں۔ اندھا دونوں ہاتھوں سے اپنا سر ٹٹولتا ہے۔ اس کے ہاتھ پانی اور خون سے سن گئے ہیں۔ وہیل چیر کے پہیئے جھٹکے سے بے قابو ہو کر بائیں طرف کو چلنے لگے ہیں۔ وہ اپنا توازن برقرار رکھنے کی کوشش میں اپنے ہاتھوں کو ادھر ادھر پھیلا رہا ہے۔ اس سے پہلے کہ بچے دوڑ کر اس کی مدد کریں، غلطی سے پانی اور خون میں تر اس کا ہاتھ ٹوسٹر پر پڑ گیا ہے۔ اس کے بائیں ہاتھ کی تین انگلیاں ٹوسٹر کے اندر گہرائی میں چلی گئی ہیں۔ اندھے کے منہ سے ایک خوفناک مگر صرف آدھی چیخ ہی برآمد ہوتی ہے۔ وہیل چیر پر بیٹھے بیٹھے کچھ لمحوں کے لئے اس کا جسم اوپر نیچے جھٹکے کھاتا ہے، جیسے گندے پانی میں مینڈک اچھلتا ہے۔ پھر یہ جسم سیاہ ہو کر بے حس و بے جان ہو جاتا ہے۔" (ص: ۱۲۳۔۱۲۲)

آیئے اب اوپر کے اقتباس کا ذرا تجزیہ کر لیتے ہیں۔

غور کیجئے کہ عورت غصہ میں نہ صرف کانپ رہی ہے بلکہ اس کے منہ سے تھوک کے جھاگ بھی نکل رہے ہیں۔ اس کی آنکھیں سرخ ہیں اور اپنے حلقے سے ابل آئی ہیں۔ اس کے جبڑے بھی پھیلے ہوئے ہیں اور وہ ایک پاگل کتیا نظر آ رہی ہے۔ اب اس "پاگل کتیا" کو عالم غیض وغضب میں بھی خود پر اتنا ضبط ہے کہ یہ مرد پر حملہ کرنے میں پہل نہیں کرتی جبکہ اندھا مرد جو کہ خاموش بیٹھا ہوا تھا "دفعتاً" اپنی ٹوٹی اور پلاسٹر چڑھی ہوئی ٹانگ سے عورت کے "پیٹ پر ایک زبردست لات مارتا ہے"۔ تفکر کا مقام ہے کہ جس شخص کی ٹانگ ٹوٹی ہوئی ہو اور اس پر پلاسٹر چڑھا ہو، وہ بیچارہ اپنی ٹانگ کیسے اٹھا سکے گا۔ چلئے ، مان لیتے ہیں اس سورداس نے کسی طرح اپنی ٹوٹی ٹانگ اٹھا بھی لی تو پھر اتنے وقفہ میں جب کہ مرد کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ بدقت تمام اٹھ رہی ہوگی کیا عورت کو اس بات کا ادراک نہیں ہوا کہ اب وہ اسی اٹھے ہوئے ٹانگ سے اس کے جسم پر حملہ کرے گا؟ کیونکہ اگر مرد کی ٹانگ درست ہوتی تو یہ مانا جا سکتا تھا کہ اس نے یکا یک عورت کو مار دیا، لیکن جب ٹانگ نہ صرف ٹوٹی ہوئی ہے بلکہ اس پر پلاسٹر بھی چڑھا ہوا ہے، مرد کو اپنا ٹانگ اٹھانے اور عورت پر حملہ آور ہونے میں کچھ وقت تو بہرحال لگا ہی ہوگا کیونکہ وہ آنکھوں سے معذور تھا لیکن عورت کی بینائی تو موجود تھی۔ اتنے پر ہی اکتفا نہیں، سابقہ اقتباس کی طرح (جہاں مرد عورت کو پوری طاقت سے دھکا دیتا ہے) یہاں بھی مرد عورت کے پیٹ پر ایک "زبردست لات مارتا ہے" لیکن "عورت تھوڑا سا پیچھے کی طرف پھسلتی ہے۔" اتنا سب کچھ سمجھنے کے لئے ہمارا یہاں قیام کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

یہ بات بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے کہ دنیا میں ایسی کون سی عورت ہے جس کے پیٹ پر "زبردست لات" ماری جائے اور بجائے اس کے کہ وہ اپنا پیٹ پکڑ کر کچھ دیر یا کافی دیر تک درد سے بلبلانے اور تڑپنے کے، وہ نہ صرف بس "تھوڑا سا پیچھے کی طرف پھسلتی ہے" بلکہ فوراً ہی خود کو سنبھال بھی

لیتی ہے اور بدلے میں اپنے شوہر پر پلٹ کے وار کرنے کے احتراماً اس پر صرف تھوک کر ہی رہ جاتی ہے۔ میری عقل یہاں حیران ہے کہ وہ عورت جس کے غیض وغضب کا یہ عالم تھا کہ راوی اسے 'پاگل کتیا' سے تشبیہ دیتا ہے، اسی پاگل کتیا کے ضبط کا یہ عالم کہ پیٹ میں زبردست لات مارے جانے کے باوجود وہ محض تھوک کر ہی مطمئن ہے۔ اس اقتباس سے ذرا قبل، ناول کے صفحہ ۹۷ میں جہاں ناول نگار ہمیں سائنس کی درسی کتابوں میں لکھی ہوئی بات دوبارہ یاد کراتا ہے کہ ''وائرس بیکٹیریا سے بھی بہت چھوٹے خوردبینی اجسام ہوتے ہیں۔۔تا۔۔کسی جسم میں ہونے کی توقع کی جاتی ہے'' وغیرہ، اس کے شعور سے یہ بات کیسے پھسل گئی کہ مرد کے برخلاف عورت کا جسم زیادہ نازک ہوتا ہے بالخصوص اس کے پیٹ کا حصہ جہاں بچے دانی اور اہم نسوانی اعضا ہیں۔ اور یہ کہ مرد ہو یا عورت پیٹ پر ''زبردست لات'' کا وار دونوں ہی پہ یکساں اثر کرتا ہے، بلکہ عورت پہ کچھ زیادہ۔ لہٰذا اس مقام پر مرد کے ذریعہ عورت کے پیٹ پر زبردست لات کا مارنا نہ صرف مضحکہ خیز ہے بلکہ حد تو یہ ہے کہ عورت کے سنبھلنے اور پھر اس کے محض تھوکنے ('محض' اس لئے کہا کیونکہ پیٹ پر لات مارنے کے بعد بدلے میں اس پر صرف تھوک دینا بہت ہی بے ضرر سائل ہے) کے بعد اسی انداز سے مرد نے عورت کے پیٹ پر دوبارہ لات ماری۔ مگر خدا جانے یہ عورت ہے یا خاتون آہن جسکا پیٹ دو لاتیں خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہوئے درد کا تاثر تک نہیں دیتا ہے، وہ فوراً ہی بغیر ایک لمحہ گنوائے مرد کے سر پر کچے شیشے کا بنا ہوا پانی کا جگ مار کر اس کا سر زخمی کر دیتی ہے۔ مرد ہونقوں کی طرح اپنا ہاتھ ادھر ادھر کرتا ہے، اور جب اس کا وہیل چیئر بے قابو ہو کر دوسری طرف کو چلنا شروع کر دیتا ہے، جانے کیسے پہلے مرد کا ہاتھ ٹوسٹر پر پڑتا ہے، پھر اس کی انگلیاں اس کے اندر گہرائی تک جاتی ہیں، اس کے بعد اس کی گیلی انگلیوں کو بجلی کا جھٹکا لگتا ہے اور پل کی پل میں اس کا جسم سیاہ ہو کر ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔

اگر مذکورہ بالا اقتباس (ب) کے سلسلہ میں مبالغہ کا لفظ بے محل معلوم ہوتا ہے تو میں اس اقتباس کے پس منظر میں لئے چلتا ہوں جو میرے مفروضے کو بہتر طور پر ثابت کر دے گا۔ اور وہ یوں ہے کہ گلاب اپارٹمنٹس کے فلیٹ نمبر ۱۳ میں جو خاندان رہائش پذیر ہے وہاں پانی کی سپلائی بند ہو گئی ہے۔ (کتنے دن سے یہ نہیں پتہ۔ زماں کا تصور شاید جان بوجھ کر اس ناول سے غائب ہے تا کہ قاری پر موت اور ناول کے کھردرے بیانیہ کا تاثر کچھ یوں قائم ہو جائے کہ ناول کے عالیشان لبادے سے یہ جھانکتے ہوئے سوراخ اس کی نظروں سے محو رہیں۔ کیونکہ اگر ہم یہ فرض لیں کہ کسی ایک فلیٹ میں گذشتہ دو یا تین دنوں سے پانی کا ایک قطرہ تک نہیں آ رہا ہے بلکہ جو تھوڑا بہت پانی اسٹاک میں تھا وہ بھی ختم ہو گیا ہے تب بھی جس قسم کا منظر نامہ ہمیں ناول میں دکھایا گیا مثلاً انسانی فضلات سے بھرا ہوا بیت

الخلاء، کچن میں جھوٹے برتنوں کا انبار اور سارے گھر میں سوکھے پیشاب کی ایسی کھرانڈ وغیرہ، اس پہ اعتبار بہت مشکل ہی سے ہوسکتا ہے۔ لطیفہ تو یہ ہے کہ اگر زمانی لحاظ سے بھی ہم مان لیں کہ کئی دنوں سے نل میں پانی کی ایک بوند تک نہیں آرہی ہے تب بھی ہمیں یہ ماننا ہوگا کہ اس گھر کے افراد پانی کی غیر موجودگی کے باوجود نہ صرف کھانا کھا رہے ہیں بلکہ وقت پر بیت الخلا بھی جاتے ہیں اور بجائے پیاس کی نقاہت سے کمزور ہونے کے ان میں اتنی توانائی اب بھی موجود ہے کہ وہ ایک دوسرے سے کھل کر لڑائی جھگڑا اور مار پیٹ کر سکتے ہیں۔ لیکن خیر جانے دیجئے، یہ ایک الگ بحث ہے)۔ ماں کے پاس چار سالہ بچہ بھاگا بھاگا آتا ہے جس کے پیٹ میں درد ہے، تاکہ وہ اسے پاخانہ کرانے میں مدد کرے۔ چڑچڑائی ہوئی عورت بچہ کو دھتکار دیتی ہے۔ ابھی وہ بچہ سنبھل ہی رہا ہوتا ہے کہ آٹھ سالہ لڑکا بھی نیکر اتارتے ہوئے چلا آتا ہے اور دونوں میں تکرار ہوتی ہے کہ پہلے کون فارغ ہوگا۔ اس مقام پہ شاید ایک پل کو ناول نگار کو بھی خیال آیا ہوگا کہ اس نے سارا واقعہ مضحکہ خیز بنا دیا ہے لیکن بعض ادیبوں کا اپنا ایک آمرانہ رویہ ہوتا ہے اس لئے ناول نگار نے، باوجود اس کے کہ اسے سارا منظر بڑا ہی مضحکہ خیز معلوم ہونے لگا تھا، یہ کہہ کر کہ 'مضحکہ خیزی اور لطیفوں میں ایک ایسی دہشت چھپی رہتی ہے جس کو اگر محسوس کر لیا جائے تو ہماری ہڈیاں بجنے لگیں' اس نے بیانیہ کو بہر حال آگے بڑھایا۔ اس معاملہ کی یہیں تک حد بندی کی جاسکتی تھی لیکن ناول نگار کی جدت طرازی کو یہ قبول نہیں تھا کہ بات صرف پیشاب پاخانوں تک محدود رکھی جائے۔ وہ اپنے بیانیہ کو بڑھاتے ہوئے ایک گیارہ سالہ لڑکی کو بھی کمرے میں داخل کراتا ہے جو ابھی ابھی اپنی زندگی کے پہلے ایام حیض سے دوچار ہوئی ہے اور جسے قطعاً اندازہ نہیں کہ اس کی شلوار خون میں کیوں تر ہے اور اس کے پیڑو میں درد کیوں ہو رہا ہے۔ اسے اپنی ماں سے ان دو سوالات کے جواب اور ماہواری کی پٹیاں باندھنے کا طریقہ جاننا تھا۔ لیکن اس انکشاف پر لڑکی کی ماں نہ صرف از حد چراغ پا ہو جاتی ہے بلکہ اسے زدوکوب بھی کرتی ہے۔ اقتباس دیکھئے:

(ج) ''بچی ماں کو اپنی شلوار کی طرف دیکھنے کا اشارہ کرتی ہے جس پر خون کے دھبے ہیں۔ میرے پیڑو میں بہت درد ہو رہا ہے۔ وہ رو کر کہتی ہے۔ مرجا حرافہ۔ ابھی ہی جوان ہونے کو رہ گئی تھی۔ دیکھتی نہیں کہ گھر میں پانی نہیں ہے اور تو مہینہ شروع کر کے بیٹھ گئی۔ عورت بچی کی پیٹھ پر زور زور سے گھونسے مارتی ہوئی چیخنے لگتی ہے۔ بچی روتی جاتی ہے۔ ماں مارتی جاتی ہے۔ مرد زور سے دہاڑتا ہے۔ عورت بچی کو گھسیٹتے ہوئے کپڑوں کی الماری کے پاس لے جاتی ہے اور کہتی ہے کہ اس سے بہتر تو یہ ہے کہ خدا موت دیدے۔'' (ص: 119)

میں اس بات کا معترف ہوں کہ شدید تناؤ اور غصہ انسانی نفسیات پر اثر انداز ہوتا ہے جو اس

کے برتاؤ کو متاثر کرتا ہے جس کے نتیجے میں انسان اجنبی اطوار اختیار کر لیتا ہے اور مذکورہ بالا اقتباس میں ممکن ہے کہ کچھ تو پانی کی غیر موجودگی، گھر کی گندگی اور تعفن جیسی صورتحال سے مغلوب ہو کر عورت کے مزاج میں تیزی داخل ہو گئی ہو لیکن جوں ہی میں اس بات کو قبول کرتا ہوں میرے سامنے ایک دوسری صورتحال وارد ہو جاتی ہے اور وہ یہ کہ اگر یہ معاملہ محض نفسیاتی جھمیلے کا ہی ہے تو پھر یہ عورت جو اپنی بیٹی کے پہلے ایام حیض کو دیکھ اتنا برانگیختہ ہو گئی کہ اس کی پیٹھ پر نہ صرف متواتر گھونسے مارتی ہے بلکہ اسے گھسیٹتے ہوئے کپڑوں کی الماری تک لے جاتی، وہی عورت اپنے پیٹ پر اندھے شوہر کی لات کھانے کے باوجود محض اس پر تھوکنے پر اکتفا کرتی ہے تاوقتیکہ اس کے پیٹ پر دوسری بار مارا جاتا ہے اور اب وہ اپنے شوہر کے سر پر شیشے کا جگ دے مارتی ہے جس پر اس کا شوہر مرنا تو درکنار درد سے بلبلاتا تک نہیں ہے۔ دوسرے طریقے سے تمام باتوں کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں یہ اندازہ لگانے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہوتی ہے کہ گلاب اپارٹمنٹس کے فلیٹ نمبر ۱۳ کے مکین ایک خوشحال گھرانے کے لوگ ہیں۔ فلیٹ کی قیمت (جس وقت اسے خریدا گیا تھا) چالیس لاکھ روپئے تھی (جو یقیناً اتنے دنوں میں بڑھ گئی ہوگی)۔ یہ ایک ایسا فلیٹ ہے جہاں ٹوائلیٹ مشرقی اور مغربی دونوں اقسام کے ہیں اور مرد کی آمدنی بھی خاصی ہے۔ اس لئے یہ بات ہمارے ذکر سے خارج ہو گئی کہ مفلسی، تنگدستی یا کسی قسم کی معاشی تنگی پانچ نفوس پر مشتمل اس خاندان پر آنے والی مشکلات (بشمول مرد کی موت) کی ذمہ دار ہے۔ محض پانی کی عدم دستیابی کو اگر وجہ بنایا جائے تو اس سے بڑا لطف اور کیا ہوگا کہ اس پورے واقعہ میں ایک بار بھی کوئی پانی پانی نہیں پکارتا ہے۔ لڑکی کا حیض دیکھ کر عورت سیدھے موت ہی کی دعا مانگتی ہے گرچہ اس پورے منظر کے سیاق میں ایسا کوئی بھی قابل ذکر واقعہ نہیں ہوا ہے جو عورت کو ایسی دعا مانگنے پر مجبور کرتا (خیر، موت کی دعا تو اب وقت بے وقت، بنا موقع محل دیکھے بھی لوگ مانگنے لگتے ہیں۔ اس پر مجھے زیادہ واویلا کرنے کی ضرورت نہیں)۔ کسی حد تک وہ گیارہ سال کی لڑکی جو ابھی ابھی زندگی کی ایک انجانی اور فطری لیکن ذرا دردناک حقیقت سے

دو چار ہوئی ہے اور جس کی وجہ سے اسے اپنی ماں سے اذیتیں سہنی پڑیں، اگر وہ موت کی دعا مانگتی تو شاید بات کچھ شعور میں ٹھہرتی بھی۔ ناول نگار اس موقع پر جب اس لڑکی کے شلوار پر خون کی پہلی لکیر نظر آئی اور اس کے پیڑو میں درد شروع ہوا اگر اس کے اندرون جذبات کی ترجمانی کرتا تو شاید درد کا ایک بہترین تاثر قائم ہوتا، لیکن۔۔۔خیر جانے دیجئے۔

ناول کا آغاز جس پر اسرار طریقے سے کرنے کی کوشش کی گئی تھی اس کا اختتام اتنا ہی افسوسناک ہوا۔ گرچہ اول تا آخر اس ناول کی پہلی قرأت ہی کسی بھی ذی فہم قاری پہ یہ راز افشاں کردے

گی کہ پوری کہانی کا تانا بانا کرونا وائرس کے پس منظر میں بنا گیا ہے۔ کالرا کی وبا کا سہارا لے کر ناول نگار نے جس قسم کی تباہی، بربادی، انسانی آلام ومصائب وغیرہ کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کی ہے وہ ہو بہو گذرے ہوئے سال کے ناقابل فراموش واقعات کا عکس ہے۔ وبا کا نام بدل دینے سے واقعات تبدیل نہیں ہو گئے۔ وبا کا تیزی سے پھیلنا، وائرس کا تفصیلی ذکر، کثرت اموات، تالہ بندی (بمعنی لاک ڈاؤن)، عوام وخواص کا اس وائرس کی زد میں آنا، اس کے علاوہ ناول کے صفحہ ۹۷ تا ۹۹ پہ دی گئی وائرس اور اس کے متعلق تمام سائنسی تفصیلات اور ملک کی موجودہ صورتحال ذکر نیز ناول کے اختتام پہ قوت مدافعت (herd immunity)، اینٹی باڈیز، اینٹی جین جیسے اصطلاحات کا استعمال کیا گیا ہے وہ اس بات پر دال ہے کہ وبا کا نام محض تبدیل کر دیا گیا تھا باقی اس کی تمام تر خصوصیات اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے حالات جوں کے توں برقرار رکھے گئے۔ ناول کا المیہ اسکا اختتام ہے۔ جس کمزور ترین انداز سے وبا کے پھیلنے کا سبب آخر میں نل کے مستری کے ذریعہ دریافت کیا گیا (جو اتفاقی طور پر ایک ایسی جگہ دریافت کر لیتا ہے جہاں ہائی ٹینشن تار گرنے کی وجہ سے بجلی کا دھماکا ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں نہ صرف ایک بڑا گڈھا پیدا ہو جاتا ہے بلکہ کئی مویشی بھی اس بجلی کی زد میں آکر اسی گڈھے میں مر جاتے ہیں جہاں انکا جسم سڑ جاتا ہے۔ ٹھیک اسی مقام پر جہاں گڈھا ہوا تھا اور مویشوں کی لاشیں سڑ رہی تھیں، ایک سیور پائپ گذرتا تھا جو اس حادثے کے سبب پھٹ گیا تھا اور اسی سیور پائپ کے دو فٹ نزدیک پانی کا پائپ تھا جہاں سے ساری گندگی شامل ہو رہی تھی اور شہر میں پراسرار 'وبا' کے پھیلنے کا سبب بن رہی تھی۔ لیکن بالآخر یہ نل کا مستری بھی ملٹری کی فائرنگ پریکٹس میں اتفاقی طور پر گولی کی زد میں آجاتا ہے) ایک آخری اقتباس دیکھیں۔

''تو یہ تھا اس پراسرار بیماری کا راز۔ اس کا ماخذ یا مرکز۔ ماخذ ہمیشہ گندے ہوتے ہیں چاہے وہ انسانوں کے ہوں یا کسی اور شئے کے۔ بڑے بڑے سائنسی ادارے اور انکی جماعتیں، ڈاکٹر، انجینئر جس خرابی کا پتہ نہ لگا سکے اسے ایک معمولی نل والے نے کھوج لیا۔ ایک غریب پلمبر نے۔ وہ تقریباً دوڑتا ہوا واپس آنے لگا۔ اسے شہر جانا ہے۔ پولس کو مطلع کرنا ہے پھر اسے اخبار، ریڈیو اور ٹیلی ویژن تک پہنچنا ہے۔ انہیں یہ خوش خبری سنانا ہے کہ یہ محض ایک تکنیکی خرابی تھی۔ ملٹری پر اس کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ انہوں نے میڈیا تک یہ خبر پہنچنے ہی نہیں دی ہوگی کہ ان کے ممنوعہ علاقے میں ہائی ٹینشن تاروں کے آپس میں الجھ جانے کے باعث کبھی بجلی گری تھی۔'' (صفحہ:۱۵۲)

اس پیراگراف کو پڑھنے کے بعد مجھ پر کیا گذری یہ بات خارج از بحث ہے تاہم اس کو پڑھنے کے بعد میں نے ناول کا سرورق پھر سے پلٹ کر دیکھا۔

''ایک خنجر پانی میں'۔خالد جاوید''۔

'موت کی کتاب' اپنے موضوع، اسلوب، کہانی پن اور بیانیہ کی جدت کاری کی بنا پر ایک بہترین پیش کش تھی اور یہاں تک بات ٹھیک تھی۔لیکن ادب (شعری ہو یا نثری) میں دہرائے جانے کا عمل بہت زیادہ سودمند ثابت نہیں ہوتا۔کوئی بھی موضوع، خواہ وہ موت یا انسانی دکھوں کے حوالے سے ہی کیوں نہ ہو، بہت زیادہ دہرائے جانے سے اپنی وقعت کھودیتا ہے۔موازنہ ہرگز مقصود نہیں تاہم یہاں میں نیر مسعود کا حوالہ دینا ضروری سمجھتا ہوں جنکے چار افسانوی مجموعوں میں بمشکل چند ایک کو چھوڑ کر بقیہ تمام افسانوں میں کسی نہ کسی کردار کی خاموش اور اداس موت یقینی ہوتی ہے اور نہ صرف وہ کردار اپنے خارجی وداخلی مصائب کے دائرہ میں محصور اس دنیا کو خاموشی سے الوداع کہہ کر ہمارے درمیان سے بغیر کسی شور شرابے کے رخصت ہوجاتا ہے بلکہ انکی زندگی کا تانا بانا مختلف النوع مسائل اور دشواریوں کے ارد گرد ہی بنا جاتا ہے۔نیز نیر مسعود کے افسانوں میں خاموشی سے مرنے والا ہر کردار ہمارے ذہن پر نہ صرف ایک اداس نقش قائم کرجاتا ہے بلکہ مختصر سی مدت میں ہم اس کردار سے اس قدر مانوس ہوجاتے ہیں کہ اس کے گذر جانے سے ہماری ذات میں ایک خلا سا پیدا ہوجاتا ہے۔لیکن اس کے برعکس زیر بحث ناول میں موت اپنے سارے تام جھام کے ساتھ ہمارے سامنے وارد ہوتی ہے اور شور شرابے کے ساتھ انسان کی زندگی کو اپنے نرغے میں لئے ہمارے درمیان سے رخصت ہوجاتی ہے۔قبل اس کے کہ ہم کسی کردار سے اپنا ذہنی یا جذباتی ربط بنا پائیں، اس کردار کی غیر متوقع اور زبردستی کی موت واقع ہوجاتی ہے جس سے ہمیں اس کے ہونے یا نہ ہونے کا کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔موت، جس کے سبب نہ صرف ناول کی کہانی اور اس کے بیانیہ کو ٹھیس پہنچی بلکہ عجلت میں کرداروں کے ساتھ بھی منصفی نہیں کی گئی (بلکہ میں یوں کہوں کہ بجلی کے زبردستی کے جھٹکوں اور فائرنگ کے ذریعہ انکی طبعی/ اتفاقی موت کے بجائے انکے قتل کا تاثر پیدا گیا۔ایسا لگتا ہے کہ یہ تینوں کردار اپنی زندگیوں میں خوشی کا تصور نہ ہونے کے باوجود جینے کے آرزومند تھے لیکن ناول کے ٹریٹمنٹ کا تقاضا انکی منشا کے برخلاف تھا)، ان سب کے باوجود اپنی وجودیت منوانے اور ہمارے ذہن پر اپنا ایک تاثر ثبت کرنے میں ناکام رہتی ہے۔یہ بہت مناسب ہوا کہ موت کا خنجر پانی میں چلا گیا۔بہتر ہے اسے اب وہیں رہنے دیا جائے۔ورنہ کہانی کا نیا در تلاش کرنے والے گلستاں کے بجائے گورستاں کی طرف نکل جائیں گے جہاں فضا میں انہیں موت کی خوشبو تیرتی ہوئی محسوس ہوگی اور قبر کے تودے اور لوح مزار کے سوا اگر کچھ اور نظر آئے گا تو وہ بچی کچھی ہڈیوں کا ڈھیر ہوگا۔اردو فکشن کا اگر یہی مستقبل ہے تو پھر یہی سہی۔

☆☆☆

حیات جہدِ مسلسل کا نام ہے فرحتؔ جمود سے بھی مقدر کہیں بدلتا ہے

بیادِ خلیل فرحتؔ کارنجوی (مرحوم)

یو جی سی منظور شدہ

UGC APPROVED

سہ ماہی اردو امراؤتی

جلد نمبر ۱۰ شمارہ نمبر ۱ امراؤتی، مہاراشٹر (ہند) جنوری تا مارچ ۲۰۲۱ء

سرپرست : جناب منور پیر بھائی (پونہ)

مدیر

وسیم فرحتؔ (علیگ)

Email: wkfarhat@gmail.com Cell: 09370222321

نائب مدیران: کلیم ضیاؔ، احسنؔ ایوبی

مشیر

شمیم فرحتؔ

خط و کتابت کے لیے:

Waseem Farhat (Alig)
Post Box No.55, H. O,
AMRAVATI - 444601(M.S)

صرفِ زرِ سالانہ اور رجسٹری ڈاک کے لیے:

The Editor,URDU,
"Adabistan", Near Wahed Khan
UrduD.Ed.College, Walgaon Road,
AMRAVATI-444601,Maharashtra (India)

پاکستانی خریداروں کا صرف زرِ سالانہ بھجوانے کیلئے:

بزمِ تخلیقِ ادب پاکستان

II-B/18، کمرشل ایریا نزد سپر ایشیا بیکری، ناظم آباد، کراچی

موبائل:0321-8291908

شمارہ ہٰذا	۱۰۰ روپے
تعاونِ خاص	۲۰۰۰ روپے
لائبریری اور اداروں سے	۲۵۰ روپے
لائف ممبر شپ	۷۰۰۰ روپے

For Online Payments:
SEAMAHEE URDU
SBI ACCOUNT NO:
34961340420
IFS CODE: SBIN0000311

اگر آپ چیک یا ڈرافٹ بھیجنا چاہیں تو صرف SEAMAHEE URDU اس نام سے بھیجیں۔

UGC APPROVED
JOURNAL
ISSN 2278-229X
سہ ماہی
اردو
مدیر
وسیم فرحت (علیگ)
گوشۂ
شمس الرحمٰن فاروقی
جنوری تا مارچ ۲۰۲۱
افسانے
شمس الرحمٰن فاروقی